ڈاکٹر اصغر علی بلوچ
شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد
ڈاکٹر محمد افضال بٹ
شعبہ اُردو، الخیر یونیورسٹی، بھمبر (اے، جے، کے)

اشتراکی ادب کی اخلاقی اقدار

Progressive writers have promoted such values in their writings that were based on socialist ethics. Objectively these values were materialistic. Utility was recognized as a basic ethical value. These writers were not only humanist but also were philanthropist and believed in worship of mankind. As a result values of justice, equality and social harmony were promoted for a grand human revolution. This article is based on discussion about progressive ethical and moral values.

مارکسزم اور سوشلزم کے رجحان نے ترقی پسند تحریک کو "مادی جدلیات" کی طرف راغب کر دیا اور ترقی پسندوں کے نزدیک سیاست میں عمل دخل اور ادب میں اس کا اظہار ضروری قرار پایا یہاں تک کہ ترقی پسند شاعری کیمونسٹ پارٹی اور اشتراکی نظام فکر کا اعلامیہ بننے لگی۔ بقول وارث علوی:

> "شاعر، شاعری دل ہی سے کرتا ہے لیکن کیمونسٹ شاعر کا دل بھی اس کی پارٹی ہوتی ہے اور دماغ بھی۔"(۱)

اس لحاظ سے اشتراکیت کو ترقی پسند آدرش کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ ادب نہ صرف سماج سے وابستہ ہوا بلکہ سماج کی مختلف تحریکات کا ایک ہتھیار بن گیا جس سے صحافت و ادب کی درمیانی تفریق کم ہونے لگی۔ ادب روحانی تقاضوں، اخلاقی معیارات اور آرٹ کے مقاصد کو محدود اور نامکمل سمجھ کر مادیت سے وابستہ مسائل کو بیان کرنے لگا۔ ترقی پسندوں کے اس رجحان پر نکتہ چینی کرتے ہوئے آلِ احمد سرور کہتے ہیں:

> "انصاف کا تقاضا ہے کہ اس تحریک کے بعض علم برداروں میں بڑی سطحیت، بڑی رعونت، بڑی تنگ نظری، بڑی قطعیت ہے۔ یہ زندگی کو سیاسی فارمولوں اور اقتصادی اُصولوں کے سوا کچھ نہیں سمجھتے۔ یہ اب سے دس سال پہلے جو لکھا ہے اسے حرفِ غلط کی طرح مٹانا چاہتے ہیں اور یہ ایک اچھے ادیب کے منصب کے خلاف ہے۔ یہ ایک ذہنی غلامی سے نکال کر دوسری ذہنی غلامی میں انسان کو مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ فن سے ناواقفیت کو آرٹ سمجھتے ہیں اور طوائف کو ہیروئن۔ یہ مذہب، اخلاق اور تہذیب کو آثارِ قدیمہ کہتے ہیں اور مارکس کو انسانیت کا "حرفِ آخر"۔"(۲)

یہ رائے بعض ترقی پسند ادبا سے مشروط کی گئی ہے اس لیے اس میں بڑی حد تک صداقت موجود ہے۔ ترقی پسندوں پر یہ اعتراضات بے جا بھی نہیں ہیں۔ انھیں شروع ہی سے جو رجحانات مرغوب تھے ان میں یہ شدت پسندی دیکھی جاسکتی ہے جو بعدازاں اس تحریک کی ناکامی کا سبب بھی بنی اور اسے سیاسی و غیر سیاسی دھڑوں میں تقسیم کر کے اندرونی خلفشار سے دوچار کیا۔

آرٹ اور سیاست کو جزولاینفک سمجھنا کوئی عیب نہیں ہے لیکن اسے کسی مخصوص جماعت یا لابی کا آلہ کار بنانا قابلِ تعریف نہیں ہوسکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ علی سردار جعفری کے الفاظ میں آج کے عہد کی سب سے بڑی مایا سیاست ہے اور ادب اور تحریک کا اپنے ملک کی قومی اور انقلابی سیاست سے متاثر ہونا فطری عمل ہے۔ لیکن ساتھ ہی علی سردار جعفری یہ بھی کہتے ہیں کہ ادب اور تحریک کو کسی سیاسی جماعت کا آلہ کار نہیں بنایا جاسکتا۔ (۳) ترقی پسند تحریک جب تک سیاسی جماعت کا آلہ کار نہ بنی اس وقت تک سماجی اور جمالیاتی دونوں حوالوں سے ادب کی نمائندہ تحریک رہی اور اسے اپنے عہد کے اہم شعرا و ادبا کی طرف سے بھرپور عملی تعاون رہا۔ جس طرح کہ ترقی پسندوں کی دوسری کانفرنس ۱۹۳۷ء منعقدہ الٰہ آباد میں اُردو اور ہندی کے اہم ترقی پسند ادبا اور سیاسی رہنماؤں کے علاوہ مولوی عبدالحق اگرچہ خود شرکت نہ کر سکے لیکن اپنا صدارتی خطبہ بھیج کر نہ صرف ترقی پسند تحریک کی حوصلہ افزائی کی بلکہ چند مفید مشورے بھی دیئے۔ اسی طرح اگلے سال مارچ ۱۹۳۸ء میں بھی الٰہ آباد کے مقام پر ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں فیض احمد فیض، ڈاکٹر عبدالعلیم، حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر اعجاز حسین، احتشام حسین، وقار عظیم وغیرہ نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں جواہر لال نہرو نے تقریر کی اور رابندر ناتھ ٹیگور جیسے عظیم بنگالی شاعر نے ترقی پسندوں کے نام پیغام بھیجا۔

جواہر لال نہرو نے ترقی پسندوں کو سیاست اور ادب کے مابین فاصلے اور قربت کے حوالے سے جو مشورہ دیا اس میں بھی انہیں ایک خاص حد میں رہنے کی تلقین کی۔ اُن کے الفاظ ہیں:

> ''ایک بات سے میں جھجکتا ہوں وہ یہ کہ ایسا ادب لکھتے وقت اکثر لوگ خاص خاص فقرے، خاص نعرے دہرانے لگتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح انہوں نے ایک زبردست خیال رکھ دیا لیکن معقول لکھنے والے کے لیے یہ زیبا نہیں اور نہ اس میں آرٹ ہے نہ کوئی خاص بات، نہ کوئی خاص پیغام، ایسی چیزوں کی جگہ صرف سیاست میں ہے۔'' (۴)

کمیونزم کی طرف حد سے زیادہ جھکاؤ ہونے کے باعث دوسری جنگ عظیم کے آغاز ہی میں ترقی پسند تحریک کو کمیونسٹ پارٹی کا حصہ قرار دے کر اس پر پابندی لگادی گئی اور سیّد سجاد ظہیر، علی سردار جعفری اور ڈاکٹر عبدالعلیم جو اس تحریک کے روحِ رواں تھے گرفتار کر لیے گئے۔ یوں یہ تحریک عارضی طور پر تعطل کا شکار ہوگئی لیکن ۱۹۴۲ء میں جب سجاد ظہیر وغیرہ رہا ہوئے تو اس تحریک کی تنظیمِ نو کی کوشش کی گئی اور ۱۹۴۲ء میں کل ہند کانفرنس بلائی گئی جس میں مولانا صلاح الدین، میراجی، قیوم نظر، حفیظ جالندھری اور عبدالمجید سالک جیسے ادبا کو بھی مدعو کیا گیا جو عملی طور پر اس تحریک سے وابستہ نہ تھے، یوں اس کا دائرۂ عمل وسیع ہوا اور اس کانفرنس کے اعلامیے میں اعلیٰ انسانی اقدار کی ترویج و تشکیل اور معاشرتی مسائل سے آگاہی جیسی ذمہ داریوں کو اُجاگر کیا گیا۔ اس تحریک کے تحت تین

رسائل ''نیا زمانہ''، ''نیا ادب'' اور ''قومی جنگ'' کا اجراء کیا گیا اور ادبی مجالس کا اہتمام کیا جانے لگا اور اس کو سیاست اور جنس نگاری جیسے اعتراضات سے بچانے کی کوشش کی جانے لگی۔

یہ سچ ہے کہ ترقی پسند تحریک نے پرانے نظریات کو رد کیا اور نئے معیارات کو قائم کر کے نئے عالمی نظام میں مادی جدلیات کے فلسفے کو اپنا پیش رو بنایا لیکن اُن نظریات کی تہ میں جو ترقی پسندانہ فلسفہ اخلاق اُبھر کر سامنے آیا اُس کے نمایاں عناصر درج ذیل ہیں:

۱۔ رومانویت کی ذاتی وجدانیت اور انفرادیت کے بجائے ادب حقیقت نگاری کے قریب آ گیا اور حقیقی زندگی کی عکاسی کرنے لگا اس طرح روایت کی پابندی کے بجائے اس میں واقعیت نگاری کا پہلو غالب آیا جس نے ادب کو اجتماعی شعور کے قریب کر دیا۔

۲۔ حقیقت نگاری اور اخلاقیات کی کش مکش کا مسئلہ بھی ترقی پسند تحریک میں بار بار سر اُٹھاتا رہا ہے چونکہ حقیقت نگاری کا یہ دعویٰ ہے کہ اُسے اخلاق یا کسی بیرونی قدر کے دباؤ سے انحراف کی اجازت ہے اس لیے آزادی رائے جو سب کا حق ہے اُس کا تقاضا ہے کہ دوسروں کی آزادی کا احترام کیا جائے۔ اس لحاظ سے اجتماعی اخلاق کا پرتو ادب کی بنیادی قدر کے طور پر سامنے آیا۔ اس اجتماعی اخلاق کا اظہار حقیقت نگاری کی اہم خصوصیت شمار ہوتا ہے بقول عزیز احمد:

> ''اخلاقیات انسانوں کے ہزاروں سال کے عملی تجربے کا نچوڑ ہے۔ انھیں آپس میں اچھی طرح رہنا سکھاتی ہے اگر انھوں نے کسی فعل کو برا قرار دیا ہے تو یہ اتنے ہزار سال کے ہمدرد انسانوں کا فیصلہ ہے۔ اس فیصلے کا ساتھ دینا بھی ایک طرح کی حقیقت نگاری ہے۔''(۵)

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو بعض ایسے اخلاقی اصول دنیا بھر کی ہر قوم ہر ملت اور ہر طبقہ خیال میں یکساں موجود ہیں جو اخلاقیات کا جوہر ہیں اور جن پر دنیا بھر کے فلسفہ ہائے اخلاق میں اشتراک عمل پایا جاتا ہے۔ ایسے اخلاق ترقی پسندوں کے ہاں بھی موجود ہیں۔ بقول عزیز احمد:

> ''دنیا کے تمام مذہبوں اور بڑے فلسفوں کی طرح اشتراکیت کے اخلاق کی اساس بھی ان تمام اچھائیوں پر ہے جن میں انسان کی اجتماعی بھلائی اور ان تمام برائیوں کی ممانعت پر ہے جس سے انسانوں میں انتشار، تفرقہ یا تنازع پیدا ہونے کا خوف ہے۔''(۶)

۳۔ ترقی پسند ادب چونکہ اجتماعی خواہشات اور صحت مند تصورات کا آئینہ سمجھا گیا ہے اس لیے یہ اجتماعی معاشرتی اخلاقیات کا بھی پابند ہوتا ہے یہ بات ٹھیک ہے کہ ترقی پسندوں کے ہاں بورژوا اور پرولتاری طبقے کا اخلاق الگ الگ ہے لیکن اِسے خانوں میں تقسیم کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ بعض عالمگیر مسلمہ اخلاقی اصول وضع کیے جائیں جن سے کسی طبقے کا استحصال نہ ہو۔ مذہبی، سماجی، سیاسی اور معاشی سطح پر ہر قسم کی منافرت، تعصب اور نفرت کا خاتمہ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند ادب اور اخلاق کے مقاصد کو ایک قرار دیتے ہوئے احتشام حسین کہتے ہیں:

''ادب اور اخلاق دونوں کا مقصد یہی ہے کہ ایک ایسے نظام کی بنیاد ڈالی جائے جس میں گندگی نہ ہو، فحاشی نہ ہو، حسد نہ ہو، نفرت نہ ہو۔ ایسا نظام، نظریہ اور عمل کے اتحاد سے قائم ہو سکتا ہے اور بہت سے ادیب آج اسی قیام کے متمنی ہیں۔''(۷)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترقی پسند ادب نظریہ و عمل کی وحدت سے جس اخلاقی نظام کی تشکیل کرتا ہے وہ مجرد مظہر ہونے کے بجائے ایک سماجی نظامِ زندگی سے مربوط ہوتا ہے گویا اخلاق اور سماج کا آپس میں گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ اگر اخلاق کی اچھائی اور برائی کو جانچنا ہو تو سماجی نظام کی نوعیت کو جاننا ضروری ہوتا ہے۔ استحصالی نظامِ زندگی میں اچھے اخلاق کا پروان چڑھنا دشوار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بقول ثاقب رومی:

''ترقی پسند ادب اخلاقی پند و موعظت کے بجائے عوام میں استحصالی نظام کی موجودگی کا شعور اور اس نظام کو بدلنے کا احساس پیدا کرتا ہے۔''(۸)

ترقی پسند ادب براہِ راست اخلاق کا پرچار کرنے کے بجائے انسان کی داخلی اور خارجی زندگی پر اس طرح روشنی ڈالتا ہے کہ درسِ اخلاق دیے بغیر اخلاقی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

۴۔ چونکہ ترقی پسند ادب انسان کی معاشی آزادی کو اہم ترین تصور کرتا ہے اس لیے وہ فرد کی آزادی کو اجتماعی آزادی کا ایک جزو لاینفک خیال کرتا ہے اس لیے اچھے یا برے اخلاق معاشی نظام کی اچھی یا بری نوعیت پر منحصر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معاشی برابری، انسانی مساوات اور سماجی انصاف کا راستہ ہموار کرتی ہے اور معاشی بدحالی، عدم مساوات اور ناروا تفریق سے سماجی قباحتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے ثاقب رزمی کا یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ ''ترقی پسند ادب زندگی کے معاشی پہلو کی آزادی اور مساوات ہی میں انسانیت کی نجات سمجھتا ہے۔''(۹)

چونکہ ترقی پسند ادب کے نزدیک اعلیٰ انسانی اقدار، سماجی اقدار سے جڑی ہوتی ہیں، اس لیے وہ انسانی قدروں کو معاشی اور سماجی صورتِ حال سے مشروط کر دیتا ہے۔ گویا معاشی پہلو کی غیر استحصالی نوعیت زندگی کی اعلیٰ قدروں کو جنم دیتی ہے جبکہ جبر و استحصال پر مبنی سماجی نظام زندگی اعلیٰ اقدار کو پنپنے کا موقع نہیں دیتا اور انسانی آزادی کو غصب کر کے استحصالی قوتوں کو غالب کر دیتا ہے جبکہ محمد علی صدیقی کے خیال میں:

''ترقی پسند ادب انسانی آزادی کا ادب ہے۔ انسانی مقدر پر استحصالی قوتوں کی عملداری کے خلاف ادب ہے۔''(۱۰)

اس طرح دیکھا جائے تو ترقی پسندوں کا مقصد انسانی آزادی کو زندگی گریز رجحانات سے دُور کرنا اور انفرادیت کے بجائے اجتماعی آزادی کو فروغ دینا ہے۔

۵۔ ترقی پسندوں کے ہاں بنیادی انقلابی قدر ''انسانیت'' ہے اور عزیز احمد کے مطابق:

"یہ انقلابی قدر ادب کی 'انسانیت' ہے۔ یہ نہ اسلوب ہے نہ موضوع بلکہ ایک طرح کا حسن نیت ہے۔ یہ ادب کی نیت ہے کہ جو کچھ لکھا جائے اس کا مقصد انسان کی فلاح و بہبود، انسانوں کے لیے اقتصادی انصاف کا تصور ہو۔"(۱۱)

ترقی پسند ادب میں یہی اقتصادی انصاف جلوہ گر ہے اور اسے اشتراکیت سے جوڑا گیا ہے جس میں ادب کی اس بنیادی "قدر انسانیت" کو اخلاقیات کا محور گردانا گیا ہے لیکن اشتراکیت میں 'انسانیت کی اساس' معاشی مواقع کی یکساں فراہمی اور یہ اصول ہے:

"کوئی انسان کسی اور انسان کی محنت سے ناجائز فائدہ نہ اُٹھا سکے۔"(۱۲)

مختصر طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ترقی پسند نظریات میں اشترا کی اخلاقیات کا جو تصور اُبھرتا ہے وہ انسانیت، معاشی انصاف، مساوات اور انقلاب پر مبنی ہے جس میں انسانوں میں پائے جانے والی طبقاتی کش مکش اور تضادات کو رد کیا گیا ہے۔

ترقی پسندوں کے ہاں معیارِ حسن بھی افادیت کا حامل قرار پایا۔ چونکہ وہ سماجی، معاشی اور سیاسی مساوات کے علمبردار تھے اس لیے انھوں نے قدیم تصور حسن کو ہدف تنقید بناتے ہوئے سماج گریز عناصر کی بیخ کنی کو ضروری خیال کیا اور حسن کا معیار افادیت کو تسلیم کیا جیسا کہ علی سردار جعفری کہتے ہیں:

"اگر تجزیہ کیا جائے تو آخر میں ہر حسین چیز انسان کے مفاد سے وابستہ نظر آئے گی (خواہ وہ سماجی اور جسمانی مفاد ہو خواہ ذہنی اور اخلاقی) جو چیز مفید نہیں وہ حسین نہیں ہو سکتی۔"(۱۳)

ترقی پسندوں کے اس زاویہ نظر کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ قدیم ادب کو بھی مادی افادیت کی کسوٹی پر پرکھنے لگے۔ پریم چند نے اپنے صدارتی خطبہ میں پرانے ادب پر اس طرح تنقید کی:

"ہم جس دور سے گزرے ہیں اسے حیات سے کوئی بحث نہ تھی۔ ہمارے ادیب تخیلات کی ایک دنیا بنا کر اس میں من مانے طلسم باندھا کرتے تھے۔ کہیں فسانہ عجائب کی داستان تھی، کہیں بوستانِ خیال کی اور کہیں چندر کانتا سنتوشی۔ کی ان داستانوں کا منشا محض دل بہلاؤ تھا اور ہمارے جذبہ حیرت کی تسکین۔ لٹریچر کا زندگی سے کوئی تعلق ہے اس میں کلام ہی نہ تھا بلکہ وہ مسلمہ تھا۔ قصہ قصہ ہے، زندگی زندگی۔ دونوں متضاد چیزیں سمجھی جاتی تھیں۔ شعرا پر بھی انفرادیت کا رنگ غالب تھا۔ عشق کا معیار نفس پروری تھا اور حسن کا دیدہ زیبی۔"(۱۴)

اس بحث سے یہ مقصود تھا کہ قدیم ادب محض حسن و عشق کے روایتی تصورات میں جکڑا ہوا تھا اور اس میں زندگی اور انقلاب کے عناصر نہ ہونے کے برابر تھے۔ یہ خیالات ترقی پسند ناقدین کے اندر اس قدر راسخ ہو چکے تھے کہ انھوں نے ۱۹۳۶ء سے قبل تخلیق ہونے والے ادب کو مردہ اور بے جان کہہ کر رد کر دیا۔ ترقی پسند نظریہ سازوں نے اس روش کو اتنا عام کر دیا کہ اُردو کلاسیکی ادب کے تمام سرمائے کو دورِ انحطاط اور جاگیردارانہ سوچ کا حامل قرار دیا۔ یہاں تک کہ اختر حسین رائے پوری نے یہ پیش گوئی کر دی:

''ہماری کرم خوردہ شاعری اور ادب کو لوگ میوزیم میں رکھیں گے اور انھیں اس حیرت سے دیکھا کریں گے جس طرح آج ہم زمانہ قدیم کی ممیوں کو دیکھتے ہیں''۔(۱۵)

اس انتہا پسند رویے کی بازگشت ہمارے اکثر ترقی پسند ناقدین کے ہاں سنائی دیتی ہے یہاں تک کہ اختر حسین رائے پوری نے اقبال پر ''اسلامی فاشسٹی'' ہونے کا الزام لگایا اور ان کی متوازن ترقی پسندی اور اسلامی اشترا کی نقطہ نظر کے باوجود اُن پر اعتراض کیا۔قدیم اُردو شاعری کے خلاف اس روّیے کو ابوالخیر کشفی نے اس طرح بیان کیا ہے:

''اُردو شاعری اس باب میں خاص طور پر مظلوم رہی ہے۔ہمارے نہایت معتبر نقادوں نے بار ہا ایسی باتوں کو دہرایا ہے کہ قدیم اُردو شاعری گل وبلبل کی داستانوں سے عبارت ہے۔قدیم اُردو شاعری میں ایران و توران کے نقشے ہیں لیکن گردوپیش اور برصغیر پاک و ہند کی زندگی کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی اور قدیم اُردو شاعری محض جنسی جذبات یا ایسے ہی موضوعات تک محدود ہے۔اس میں فکری عنصر نہیں''۔(۱۶)

یہ وہ خیالات تھے جو اکثر ترقی پسندوں کے ہاں پائے جاتے تھے اور جن پر بعض بالغ نظر اور متوازن ترقی پسند ناقدین نے نظر ثانی کی اور قدیم ادب سے متعلق افادی نظریہ اپنانے کو فاش غلطی قرار دیا۔یہاں تک کہ مجنوں گورکھپوری نے ماضی کے ادب پر نکتہ چینی کرنے والوں کو کم ظرفوں اور سبک سروں کا گروہ قرار دیا۔(۱۷)اس کے ساتھ ہی ماضی کے ادب کا ازسرِنو مطالعہ کر کے اس میں ترقی پسند رجحانات کو تلاش کرنے اور اسے حقیقت نگاری کی روایت سے جوڑنے کی شعوری کوششیں کی گئیں اس ضمن میں احتشام حسین اور عزیز احمد کی فکری کاوشیں زیادہ نمایاں ہیں۔احتشام حسین نے اس ضمن میں جو نقطۂ نظر اپنایا ہے ملاحظہ ہو:

''ایک ضروری بات اور نظر میں رکھنے کی ہے کہ قدیم میں سب کچھ اچھا ہے اور نہ جدید میں سب کچھ برا۔نہ پرانے ادب میں خرابیاں ہی خرابیاں ہیں اور نہ نئے ادب کا ہر لفظ قابل تعریف بلکہ جس طرح پرانے ادب میں مواد اور صورت کے میل سے خوبصورت مرقعے تیار ہوئے ہیں اس طرح نئے ادب میں بھی الفاظ اور خیالات کی مدد سے دل کی بات کہی جا رہی ہے''۔(۱۸)

بہر حال کچھ بھی ہو ترقی پسندوں کو پرانے میں جو اچھا اور قابل تعریف نظر آیا ہے وہ صرف افادی نقطۂ نظر کا حامل ہونے کی وجہ سے ہے اور ترقی پسند افادیت کی بدولت ہی وہ نظیرا کبر آبادی کو اپنا پیش رو تسلیم کرتے ہیں کیونکہ وہ ٹھوس زندگی اور مادی حقائق کو پیش کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ عزیز احمد نے کارل مارکس کی سی معاشی، اقتصادی اور سیاسی تعلیم کا سراغ افلاطون، مزدک اور تامس مور کے ہاں لگایا اور قدیم ادب کو ترقی پسندانہ عینک سے دیکھتے ہوئے ہمدردانہ نقطۂ نظر اپنایا ہے:

''میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ قطعی اعتراضات سے پہلے اس کی بڑی ضرورت ہے کہ ہمدردی سے قدیم ادب کا پھر مطالعہ کیا جائے۔اس میں ترقی پسندی اور ''انسانیت'' کے بہت جوہر ملیں گے''۔(۱۹)

احتشام حسین اور عزیز احمد کی آرا سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک بھی آرٹ کی جمالیات کا انحصار اس کی افادیت، ترقی

پسندی اور معاشی وسماجی حقیقت پر ہے بالکل ایسے ہی خیالات پریم چندنے اپنے صدارتی خطبے میں بھی بیان کیے، وہ کہتے ہیں:

> ’’مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ میں اور چیزوں کی طرح آرٹ کو بھی افادیت کی میزان پر تولتا ہوں بے شک آرٹ کا مقصد ذوق حسن کی تقویت ہے اور وہ ہماری روحانی مسرت کی کنجی ہے لیکن ایسی کوئی ذوقی، معنوی اور روحانی مسرت نہیں ہے جو اپنا افادی پہلو نہ رکھتی ہو مسرت خود ایک افادی شے ہے اور ایک ہی چیز سے ہمیں افادیت کے اعتبار سے مسرت بھی حاصل ہوتی ہے اور غم بھی۔‘‘(۲۰)

حسن کا یہی افادی تصور ہے جو ترقی پسند تحریک کو فکری اساس مہیا کرتا ہے اور وہ نگاہ عطا کرتا ہے جو حسن عالم گیر کو احاطے میں لیتی ہے اور ایسے نظام حیات کا مشاہدہ کرنے کے قابل ہوتی ہے جہاں سماجی مساوات، معاشی ہمواری اور انسانیت نوازی کا دور دورہ ہوتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ وارث علوی۔ سماجی ادب کی بحث مشمولہ منتخب مضامین، کراچی، فضلی اینڈ سنز پرائیوٹ لمیٹڈ، ۲۰۰۰، ص ۱۷۸

۲۔ آل احمد سرور۔ دیباچہ شعرائے عصر کے کلام کا انتخاب جدید، مرتبہ آل احمد سرور، پروفیسر عزیز احمد کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، اشاعت پنجم،۱۹۷۳ء، ص ۱۸

۳۔ علی سردار جعفری۔ ترقی پسند ادب، علی گڑھ: انجمن ترقی اُردو ہند، اشاعت دوم، ۱۹۵۷ء، ص ۸۲

۴۔ جواہر لال نہرو۔ نیا ادب، جنوری فروری ۱۹۴۱ء، بحوالہ اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک، ص ۵۴

۵۔ عزیز احمد۔ ترقی پسند ادب، ملتان: کاروانِ ادب ۱۹۸۶ء، ص ۱۸

۶۔ عزیز احمد۔ ترقی پسند ادب، ص ۱۸

۷۔ احتشام حسین۔ تنقیدی جائزے، لکھنؤ: احباب پبلشرز، اشاعت سوم، ۱۹۵۶ء، ص ۶۵

۸۔ ثاقب رزمی۔ ترقی پسند نظریۂ ادب کی تشکیلِ جدید، لاہور: آئینۂ ادب ۱۹۸۷ء، ص ۲۶

۹۔ ایضاً، ص ۲۸

۱۰۔ محمد علی صدیقی۔ ترقی پسند ادب محرکات و رجحانات مشمولہ ترقی پسند ادب، پچاس سالہ سفر، مرتبہ: ڈاکٹر قمر رئیس، سیّد عاشور کاظمی، لاہور: مکتبہ عالیہ ۱۹۹۴ء، ص ۷۹

۱۱۔ عزیز احمد۔ ترقی پسند ادب، ص ۳۲

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۴

۱۳۔ علی سردار جعفری۔ ترقی پسند ادب، ص ۳۳

۱۴۔ پریم چند۔ نیا ادب، جنوری فروری ۱۹۴۱ء، بحوالہ اُردو میں ترقی پسند تحریک خلیل الرحمٰن اعظمی، ص ۴۲

۱۵۔ اختر حسین رائے پوری۔ ادب اور انقلاب، کراچی: نفیس اکیڈمی ۱۹۸۹ء، ص ۲۵

۱۶۔ ابوالخیر کشفی۔ اُردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر، کراچی: ادبی پبلشرز، ۱۹۷۵ء، ص ۸

۱۷۔ مجنوں گورکھ پوری۔ ادب اور زندگی، کراچی: مکتبہ دانیال ۱۹۶۹ء، ص ۲۸

۱۸۔ احتشام حسین۔ تنقیدی جائزے، لکھنؤ: احباب پبلشرز، اشاعت سوم ۱۹۵۶ء، ص ۲۰

۱۹۔ عزیز احمد۔ ترقی پسند ادب، ص ۳۶

۲۰۔ پریم چند۔ صدارتی خطبہ مشمولہ نیا ادب جنوری فروری ۱۹۴۱ء اُردو میں ترقی پسند تحریک، ص ۴۳